اسلام اور مسلمان امریکی فکر کے تناظر میں

امریکہ کو یورپی اقوام کے مقابلہ میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے استعماری دور میں مسلم علاقوں پر نہ براہ راست قبضہ کیا اور نہ ان خطوں پر سیاسی حاکمیت قائم کی۔ شاید ایک نوزائیدہ مملکت اور قوم ہونے کی بنا پر، جو یورپی اقوام کی بالادستی سے آزادی حاصل کر کے وجود میں آئی تھی، امریکہ کو خود اپنے وجود کو مستحکم کرنے اور اپنی ایک شخصیت بنانے کے عمل نے تقریباً دو سو سال تک اتنا مصروف رکھا کہ ایشیائی اور افریقی ممالک پر تسلط اور قبضہ کی طرف توجہ نہ دے سکا۔

لیکن بیسویں صدی میں اس وقت کی دو اہم سیاسی قوتیں سابق سوویت یونین اور امریکہ سرد جنگ کے دوران ترقی پذیر اور ترقی یافتہ دیگر ممالک کو اپنے زیر اثر رکھنے اور حلیف بنانے اور اس طرح اپنی برتری قائم کرنے کے حوالے سے ایک دوڑ میں مبتلا رہیں۔ اس دوڑ کا خاتمہ عملاً دیوارِ برلن کے انہدام اور اس کے بعد افغانستان میں سوویت یونین کی شکست کی شکل میں ہوا اور امریکہ بزعم خود یک قطبی قوت کی حیثیت سے تاریخ کے ایک نئے دور کے آغاز کے دعوے کے ساتھ ابھرا۔ اس نئے دور کے آغاز کا اعلان عالمگیریت (Globalization)، معلوماتی ٹیکنالوجی کے انقلاب (I.T. Revolution) اور نئے معاشی نظام (N.W.O) کے نعروں سے کیا گیا۔ ان نعروں کے ذریعہ جو پیغام دیا گیا وہ مختصراً یہ تھا کہ اشتراکی مداری اپنا تماشا دکھا کر چلا گیا اب نیا بازیگر اپنی ہنرمندی دکھائے گا۔ اور چونکہ اب صرف وہ ہی میدان میں رہ گیا ہے اس لیے اب ترقی پذیر ممالک کے لیے بغیر کسی امکانِ انتخاب کے صرف ایک راستہ ہے کہ وہ نئے نظام کو خوشی اور رضامندی کے ساتھ قبول کر لیں۔

دورِ استعمار کا دم ٹوٹتے ٹوٹتے جو مسائل عالمی حیثیت اختیار کر گئے ان میں فلسطین اور کشمیر سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ مسلمانوں اور اسلام کے بارے میں مغرب اور خصوصاً امریکہ کے تصور کی تعمیر میں ان دونوں مسائل کا کردار بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ ایرانی انقلاب سے بہت پہلے فلسطین کی تحریک آزادی

کو اسرائیلی دہشت گردی، قتل و غارت اور ظلم و جبر کو نظر انداز کرتے ہوئے مغربی ذرائع ابلاغ میں ہمیشہ نسلی، تخریبی اور غیر انسانی رویہ کے طور پر پیش کیا گیا، جس کا واضح ترین اظہار کنساس میں ہونے والے دھماکہ کے ردعمل کی شکل میں ہوا۔ گو یہ تخریبی کارروائی ایک خالص امریکی کے ہاتھوں ہوئی لیکن ملزم کی گرفتاری سے قبل اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ نے واضح طور پر اس کی ذمہ داری ''مسلم دہشت پرستوں'' پر رکھنی چاہی۔

نہ صرف یہ بلکہ الجزائر ہو یا افغانستان جب بھی کسی اسلامی گروہ کا تذکرہ آیا اس کے ساتھ ''بنیاد پرستی''، ''شدت پسندی''، ''انتہا پسندی'' اور مذہبی اشتعال انگیزی'' یا اس کے ہم معنی الفاظ استعمال کر کے یہ تأثر پیدا کیا گیا کہ اگر ہر دوسرا نہیں تو کم از کم ہر چوتھا مسلمان غیر مسلموں اور ان کی تہذیب اور تاریخ سے نفرت رکھتا ہے اور انہیں صفحہ ہستی سے مٹانے کے درپے ہے۔ مسلمانوں ہی کے حوالے سے نہیں کسی بھی قوم کے حوالے سے اگر یہ تصور قائم کر لیا جائے تو نفسیاتی طور پر اس کے ساتھ تعلقات میں خلیج کا واقع ہونا ایک فطری عمل ہے۔

ابلاغ عامہ (جس کا غالب عنصر یہودی اور صیہونی لابی کا حصہ ہے) نے اور خود اسرائیلی ذرائع ابلاغ نے مسلمانوں کی جو تصویر کشی کی، مسلم ممالک اور مسلمانوں کے حوالے سے امریکی خارجہ پالیسی کے اتار چڑھاؤ میں اس کا بنیادی حصہ ہے۔ پھر چونکہ مسلمانوں کے حوالے سے یہ بات اتنی فنکاری اور اتنی باقاعدگی سے کی گئی کہ اسے تمام مسلمانوں کے حوالے سے بطور ایمان کے تسلیم کر لیا گیا۔ جان اسپوزیٹو کے مقالے میں (جس کا ترجمہ زیر نظر شمارے میں شامل ہے) ایک امریکی محقق کے نقطہ نظر سے اس مسئلہ کا جائزہ لیتے ہوئے جو بات کہی گئی ہے وہ بہت اہمیت رکھتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ممکن ہے بعض مسلمان ویسے ہی ہوں جیسا ان کی تصویر پیش کی گئی ہے لیکن یہ بات امریکہ کے اپنے مفاد کے منافی ہے کہ وہ چند مسلمانوں کے طرز عمل کی بنیاد پر تمام مسلم ممالک اور سب مسلمانوں کے حوالے سے اپنی حکمت عملی اور خارجہ پالیسی کو محض ایک محدود تعداد کی بنیاد پر طے کر لے۔

ہر مسلمان ملک اپنے سیاسی، معاشی، اور بین الاقوامی تعلقات کے لحاظ سے انفرادیت رکھتا ہے اور اس انفرادیت کو نظر انداز کرتے ہوئے تمام مسلمانوں کو ایک خیالی ''تشدد پسند اکائی'' تصور کرتے ہوئے

خارجہ پالیسی وضع کر لینا انتہائی غیر دانشمندانہ اقدام ہوگا۔ لیکن اب اسے کیا کہا جائے کہ عملاً امریکہ مسلمانوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتا رہا ہے۔ اسپوزیٹو کا کہنا ہے کہ اب اس میں فوری تبدیلی کی ضرورت ہے۔ جدید امریکی مستشرقین جان اسپوزیٹو، جان وال، تمارا سون جس طرزِ فکر کی نمائندگی کرتے ہیں اس میں بظاہر سنجیدگی کے ساتھ اسلام اور مغرب میں ٹکراؤ کی جگہ افہام وتفہیم کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مغرب نے جس پتہ ماری کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے مختلف پہلوؤں کا تحقیقی مطالعہ کرنے کے لیے اپنے ملک کے پالیسی ساز اداروں کو مطلوبہ معلومات فراہم کی ہیں کیا ہم نے مغربی تہذیب اور فکر کا اسی سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کرنے کے بعد اس پر منطقی نقد بالخصوص اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں شکوک وشبہات کا ازالہ معذرت کے بغیر کیا ہے؟ کیا اقبال اور مودودی کو چھوڑتے ہوئے دور جدید میں ہم کسی تیسرے شخص کا نام اس حوالے سے لے سکتے ہیں؟ بلا شبہ علی شریعتی، یوسف القرضاوی، محمد خطیب اور سید قطب نے بعض پہلوؤں پر فکری رہنمائی فراہم کی ہے لیکن ان مفکرین کی تحریرات میں بھی کیا مغربی فکر کی بنیادوں، اس کے ثمرات اور اس کے عروج وزوال کا جامع انداز میں تجزیہ کر کے اسلام کے اعلیٰ اصولوں کا تقابل پایا جاتا ہے!

آج جب ہم مغرب کو ایک علمی تہذیبی مکالمے کی دعوت دے رہے ہیں۔ اسلام کی فکری اور علمی بنیادوں کے ساتھ مغربی تہذیب کی روح اور اس کی تاریخ سے مکمل واقفیت ضروری ہے یہ کام وہی ذہن کر سکتے ہیں جو نہ مغرب سے متاثر ومغلوب ہوں اور نہ اپنے مسلک ومذہب کے اندھے مقلد ہوں۔ اس کام کے لیے ذہنی وسعت کے ساتھ ساتھ اسلام کے مصادر سے براہ راست واقفیت اور غیر مناظرانہ اور غیر معذرت پسندانہ طرزِ عمل کی ضرورت ہے۔

انیس احمد